AL-AHQAQ
https://ahqaq.com/index.php/Journal
Volume.2, Issue.2 (Dec-2024)

Recognized by HEC in Y-Category
ONLINE - ISSN- 3006-595X
PRINT - ISSN- 3006-5941

ادب اور صحافت کا باہمی تعلق (تحقیقی و تنقیدی جائزہ)

Interrelationship of Literature and Journalism (Research and Critical Review)

Dr. Kaleem Akhtar Qaisrani
Assistant Professor/Head of Department (Urdu), Superior University Lahore
Email. kaleem.akhtar@superior.edu.pk
Nigarish Fatima
M.Phil. Scholar, Department of Urdu, MY University Islamabad
Email. Nigarish4@gmail.com

Abstract

The interrelationship between journalism and literature has long been a subject of debate among literary critics, with various viewpoints emerging over time. Some critics argue that literature holds greater value, emphasizing its artistic and cultural significance, while others believe that the two fields are fundamentally similar, sharing certain stylistic and thematic qualities. There are also those who assert that journalism, with its focus on current events and its direct connection to society, surpasses literature in its relevance and impact. Regardless of these differing perspectives, it is undeniable that both journalism and literature play crucial roles in shaping public consciousness and cultural identity. A key difference, however, is that literary works, if devoid of essential literary elements such as artistic expression and depth, often lose their significance over time. In contrast, the value of meaningful journalistic composition—rooted in facts, timeliness, and relevance—remains intact, particularly in its ability to inform and influence society. Both forms of writing serve distinct purposes, with literature offering timeless insights into the human experience and journalism providing immediate commentary on societal issues. This article explores the interrelationship between journalism and literature, analyzing the contributions of each to the world of writing and examining the ways in which they overlap and diverge, ultimately reinforcing the importance of both in contemporary discourse.

Keywords: interrelationship, journalism, literature, perspective, divergent, similar, literary, ingredients, composition

کلیدی الفاظ:

ادب، صحافت، ترتیب و تدوین، نتیجہ خیز سخن ہائے گفتنی، ادب پارہ، ادبی اسلوب، بندش لفظی، صحافتی ادب، اجمالی جائزہ

ادب اور صحافت کا چولی دامن کا ساتھ ہے۔ اردو ادب اور صحافت نے مغربی ادب اور صحافت سے بہت زیادہ استفادہ کیا ہے۔ اردو میں صحافت اور ادب کے حوالے سے بیشتر چیزیں مغربی ادب کے ذریعے پہنچیں۔ بعد ازاں مغرب سے موصول شدہ تمام تر رویے اور رنگ ڈھنگ ہمارا اوڑھنا بچھونا بن گئے۔ اردو کے ابتدائی دور کے اخبارات میں مغربی نظریات کو اردو میں پروان چڑھانے یا رسائل و جرائد کا پیٹ بھرنے کے

Recognized by HEC in Y-Category
ONLINE - ISSN- 3006-595X
PRINT - ISSN- 3006-5941

لیے مغربی تحریروں کے اردو میں تراجم کیے۔ مغربی ادب و صحافت سے اخذ و استفادہ کیا گیا۔ اس صورت میں عوام کے سامنے کچھ نئے موضوعات اور مضامین پیش کیے گئے، جو ان کی دلچسپی کا باعث بنے۔ اس حقیقت سے ہم کسی طرح بھی پہلو تہی نہیں کر سکتے کہ اردو ادب میں مروجہ بیشتر اصناف فارسی، عربی اور انگریزی کی عطا کردہ ہیں۔ یہ الگ بات ہے کہ ہم نے ان اصناف کو اپنے مزاج اور ضرورت کے مطابق ڈھال لیا ہے۔

جب ہم ادب اور صحافت کا جائزہ لیتے ہیں تو واضح ہوتا ہے کہ یہ بحث بہت پرانی ہے کہ ادب اور صحافت کا آپس میں کیا تعلق ہے؟ ادب اور صحافت کی سرحدیں ایک دوسرے کے کتنا قریب ہیں؟ ان کے باہمی تعلق میں رفاقت کا عنصر نمایاں ہے یا رقابت کی بازگشت سنائی دیتی ہے۔ اس حوالے سے نقادان ادب نے اپنی اپنی آرا بے لاگ طریقے سے بیان کی ہیں۔ دلچسپ صورتحال یہ ہے کہ اس موضوع پر تنقید نگاروں نے مضبوط دلائل پیش کیے ہیں۔ ان کے دلائل کس نوعیت کے ہیں اور ان کی رائے کتنی صائب ہے؟ اس حوالے سے تنقیدی جائزہ لیتے ہیں۔

ادب اور صحافت کے باہمی تعلقات کا جائزہ لیتے ہوئے درج ذیل سوالات کے جوابات ڈھونڈنا بہت ضروری ہے:۔

اول: ادب اور صحافت کا آپس میں کیا تعلق ہے؟

دوم: ہمارے تنقید نگاروں اور محققین کی ادب اور صحافت کے باہمی تعلق کے حوالے سے کیا سوچ ہے؟

سوم: کیا اخبارات و رسائل میں شامل تمام تحریریں ادب کے درجے پر فائز ہوتی ہیں؟

درج بالا سوالات کے جوابات ڈھونڈنے سے پہلے یہ دیکھتے ہیں کہ تنقید نگاروں کی سوچ کتنے گروہوں میں تقسیم ہے۔ یہ تو واضح ہے کہ ادب اور صحافت کے باہمی تعلق اور مرتبے کے حوالے سے نقادان ادب میں اختلافات موجود ہیں۔ ان کی آرا کا اجمالی جائزہ لینے سے معلوم ہوتا ہے کہ ادب اور صحافت کے حوالے سے تنقید نگاروں کے چار گروہ وجود میں آتے ہیں۔ وہ چار گروہ درج ذیل ہیں:۔

۱۔ پہلا گروہ صحافت کو ادب سے اتنا دور سمجھتا ہے کہ وہ صحافت اور ادب کا موازنہ کرنا لازمی نہیں سمجھتا۔

۲۔ دوسرا گروہ صحافت کو ادب سے کم تر درجہ دیتا ہے۔

۳۔ تیسرا گروہ ادب اور صحافت کو ایک ہی صف میں کھڑا کرنے کا حامی ہے۔

۴۔ چوتھا گروہ صحافت کو ادب پر فوقیت دیتا ہے۔

اوّل الذکر جماعت صحافت کے بارے میں یہ خیال رکھتی ہے کہ صحافت کی اہمیت اپنی جگہ پر لیکن وہ ادب کی صف میں مقام نہیں بنا سکتی۔ ان کے نزدیک صحافت نا صرف ادب نہیں ہے بلکہ اس پر رائے زنی کرنا بھی وقت کا ضیاع ہے۔ اس گروہ میں نامور تنقید نگار کلیم الدین احمد کا نام بہت اہم ہے۔ ان سے صحافت کے بارے میں اظہار خیال کرنے کا کہا گیا تو انھوں نے صحافت کے حوالے سے تبصرہ کرتے ہوئے کہا تھا:

"صحافت ادب نہیں ہے اگر یہ ادب بن جائے تو میں ضرور اس پر اظہار خیال کر سکتا ہوں۔"(1)

تنقید نگاروں کا دوسرا گروہ صحافت کو اہمیت دیتا ہے۔ وہ سمجھتا ہے کہ معاشرے میں صحافی اور صحافت کا وجود ناگزیر ہے۔ صحافت کی اہمیت کے اقرار کے باوجود بھی وہ ادب اور صحافت کو ایک صف میں کھڑا کرنے کا قائل نہیں ہے۔ دونوں کے تخلیقی مقاصد اور عناصر میں ان کے نزدیک بہت اختلاف پائے جاتے ہیں۔ وہ سمجھتے ہیں کہ ادب پارے کی تخلیق کے پس منظر میں احساسات و جذبات کی ترجمانی پائی جاتی ہے۔ ادب زمانی و مکانی حدود سے ماورا ہوتا ہے۔ ان کے مطابق صحافت کے پیچھے وقتی اور ہنگامی عناصر کار فرما ہوتے ہیں۔ اس لیے صحافت محض وقتی اور محدود

Recognized by HEC in Y-Category
ONLINE - ISSN- 3006-595X
PRINT - ISSN- 3006-5941

حیثیت کی حامل ہے۔ لہٰذا یہ گروہ صحافت کو موضوع بحث تو بناتا ہے لیکن اسے ادب کی صف میں برابر جگہ دینے کے لیے تیار نہیں ہے۔

ڈاکٹر وزیر آغا کے بقول:

> "بہ حیثیت مجموعی ادب کسی زمانے کے خارجی حالات و واقعات کی بہ نسبت اس زمانے کے میلانات ورجحانات کی عکاسی کرتا ہے۔ چنانچہ ایک تاریخی جائزہ ایک ادب پارے سے اس حد تک مختلف ہے کہ جہاں مقدم الذکر کا دائرہ عمل واقعات کی ترتیب و تدوین تک محدود ہے۔ وہاں ادب پارہ ان احساسات وجذبات کی ترجمانی کرتا ہے جو ایک خاص زمانے کی پیداوار ہوتے ہیں اور جن کے باعث اجتماعی ملکی شعور ایک حد تک مرتب ہوتا ہے۔ ادب اور تاریخ کی یہ حد فاصل کچھ اور سمٹ کر ادب اور صحافت کی حد فاصل کا درجہ حاصل کر لیتی ہے۔ وہ یوں کہ جہاں تاریخی جائزے کا میدان کافی وسیع ہوتا ہے اور یہ ایک خاص دور کے واقعات کو زیر بحث لاتا ہے وہاں صحافت کی تگ و تاز سکڑ سمٹ کر ان ہنگامی واقعات تک محدود ہو جاتی ہے جو ایک وسیع تر تاریخی جائزے میں غالباً بہت کم اہمیت رکھتے ہیں۔ نتیجہ اس کا یہ نکلتا ہے کہ جہاں تاریخی جائزہ اپنے اندر بعض مستقل حیثیت کے عناصر رکھتا ہے وہاں ہنگامی واقعات کے متعلق ایک تیز و تند بحث وقت کے ساتھ ساتھ اپنی اہمیت کھونے لگتی ہے تا آنکہ ایک دن یہ قطعاً غیر دلچسپ ہو کر رہ جاتی ہے۔ تاریخی جائزے اور ہنگامی صحافت کا یہ بنیادی فرق صحافت اور ادب کی خلیج کو کچھ اور کشادہ کر دیتا ہے اور یہ بات بالکل واضح ہو جاتی ہے کہ ادب کی حیثیت مستقل ہے اور صحافت کی حیثیت محض ہنگامی۔"(2)

ان کے نزدیک یہ فرق محض مواد اور موضوع تک محدود نہیں ہے۔ وہ سمجھتے ہیں کہ دراصل ادب اور صحافت میں جو عنصر حد فاصل قائم کرتا ہے وہ دراصل طریق اظہار ہے۔ تحریر کے پس منظر میں طریقۂ تحریر ہی ہے جو ادب کو ادب اور صحافت کو صحافت کے مرتبے پر فائز کرتا ہے۔ دونوں کی تحریری وجہ ایک ہو بھی جائے تب بھی ان میں بہت زیادہ دوری ہے۔

ڈاکٹر صاحب دلائل دیتے ہوئے مزید لکھتے ہیں:

> "لیکن ادب اور صحافت کا یہ فرق "مواد" اور "موضوع" تک محدود نہیں۔ دراصل اس کا نمایاں مظہر وہ طریق اظہار ہے جو ادب کو ادب اور صحافت کو صحافت کا درجہ عطا کرتا ہے۔ بالعموم ایک ادب پارہ جس لباس میں ہمارے سامنے آتا ہے اس کی بناوٹ، انداز اور تراش میں ادیب کے ایسے بہت سے رجحانات واحساسات بھی حصہ لیتے ہیں جن کے عمل سے وہ شعوری طور پر واقف نہیں ہوتا۔ یوں بھی کوئی ادب پارہ درحقیقت اس قدرتی سرجوشی اور اندرونی تموج کا نتیجہ ہوتا ہے جسے ادیب دبا دینے سے قاصر رہتا ہے۔ اور جو ایک طوفانی ندی کی طرح کنارے توڑتا اور اپنے اندر ایک تند و تیز بہاؤ میں ایک اپنا راستہ ایک اپنی نہج اختیار کرتا ہوا بہنے لگتا ہے۔ صحافت کے مسئلے کی

Recognized by HEC in Y-Category
ONLINE - ISSN- 3006-595X
PRINT - ISSN- 3006-5941

نوعیت اس سے جداگانہ ہے، یہاں شعوری طور پر اور ایک خاص مقصد کے پیش نظر دریا میں سے چھوٹی چھوٹی نہریں نکالنے کی سعی ہوتی ہے اور نتیجۃً اس سارے عمل پر شعوری کاوش کا تسلط قائم رہتا ہے۔ پس اگرچہ ایک ادبی اور غیر ادبی تحریر کا مقصد ایک ہی ہے (یعنی سخن ہائے گفتنی کا ناظر تک پہنچانا) تاہم ان دونوں کے طریق کار میں ایک نمایاں بُعد ہے۔"(3)

سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ کیا اصل مسئلہ یہی ہے کہ ادب اور صحافت میں کیا فرق ہے۔ یا مسئلہ اس سے مختلف ہے۔ اس کا ایک اور پہلو بھی ہے۔ اس پہلو کی طرف کچھ تنقید نگاروں نے متوجہ بھی کیا۔ یہ تیسرا گروہ رشید حسن خاں جیسے نقادوں کا ہے جن کے نزدیک اصل موضوع "صحافت اور ادب میں فرق" نہیں ہے بلکہ اصل چیز وہ 'مقصد' ہے جس کے تحت کو تخلیق کار اپنی تخلیق منصۂ شہود پر لاتا ہے۔ اگر کسی تخلیق اور تحریر کا مقصد "تجارتی" ہے تو وہ صحافی ہو یا ادیب اس کی تحریر کا ادب سے واسطہ نہیں ہو گا۔ اگر اس کی تخلیق اور تحریر کا مقصد "تجارت" سے ہٹ کر ہے تو وہ صحافی بھی ادیب ہو سکتا ہے۔

رشید حسن خاں لکھتے ہیں:

"اصل چیز لکھنے والے کا طرز عمل ہے اس طرز فکر اور انداز نظر سے بہت اچھے صحافی کی تحریر ادبی ہو سکتی ہے اور بہت اچھے ادیب کی تحریر صحافیانہ ہو سکتی ہے۔ ادب اور صحافت میں دور کی نسبت ہے۔ مگر یہ دونوں نسبتیں ایک ہی شخص میں بہ خوبی جمع ہو سکتی ہیں اور اس کی تحریروں میں نمایاں ہو سکتی ہیں۔ صحافت کا جو مزاج اور انداز ہے۔ اس سے ہم سب واقف ہیں جب ادیب بھی اس طرز اور انداز کو اپنائے گا تو وہ صحافیانہ ادب کی تشکیل کی ذمہ داری اپنے اوپر مسلط کرے گا۔"(4)

صحافت اور ادب میں قربتیں موجود ہیں۔ یہ دونوں باہم ہم رقاب ہیں۔ اس گروہ کے مطابق اردو کے آغاز سے اب تک دونوں ہم قدم ہیں۔ ان تنقید نگاروں کے نزدیک ان کے موضوعات میں کسی قسم کی بعد کا تاثر غلط ہے۔ صحافت میں بھی انسانی جذبات کا گہرا عمل دخل ہے ڈاکٹر شریف الدین کے خیالات بھی اسی گروہ سے مطابقت رکھتے ہیں۔ وہ صحافت کی اثر پذیری اور جذباتی اہمیت کے قائل ہیں۔ وہ دونوں میں باہمی ٹکراؤ کی بجائے ایک صحت مند رفاقت محسوس کرتے ہیں۔

وہ ادب اور صحافت کے حوالے سے لکھتے ہیں:

"صحافت کا زندگی اور زندگی کا ادب سے چولی دامن کا ساتھ ہے۔ آج مغرب میں ادب اور صحافت نہ صرف دوش بدوش ہیں بلکہ زندگی کی ہمہ ہمی میں دونوں کا رول لازم و ملزوم ہو کر رہ گیا ہے۔ ادب اب زندگی کا ترجمان بن گیا ہے اور زندگی واقعات کے گرد و پیش سے اپنا واسطہ نہیں توڑ سکتی۔ طاقت، قوت اور اثر میں صحافت کو پارلیمنٹ کے مماثل قرار دیا گیا ہے۔ صحافت کا انسانی جذبات واحساسات سے گہرا تعلق ہے۔ بعض مرتبہ ایک افسانہ، نظم یا غزل سے زیادہ، کسی اخبار کی سرخی ہمارے جذبات واحساسات کی دنیا میں آگ لگا دیتی ہے۔ اخبار کا ایک کارٹون تک لوگوں کی قسمت

Recognized by HEC in Y-Category
ONLINE - ISSN- 3006-595X
PRINT - ISSN- 3006-5941

بناتا بگاڑتا ہے۔"(5)

ڈاکٹر فوزیہ چوہدری کا شمار بھی اسی مکتب فکر میں ہوتا ہے۔ان کے نزدیک صحافی بھی ایک ادیب کی طرح ہی کسی واقعے یا موضوع سے متاثر ہو کر اپنی کاوش عمل میں لاتا ہے۔پھر ادبی انداز میں اس پر تبصرہ کرتا ہے۔ وقتاً فوقتاً طنز و مزاح سے بھی کام لیتا ہے۔اس مکتبۂ فکر کا مطمعٔ نظر یہ ہے کہ ادب اور صحافت کے سرحدیں ایک دوسرے سے ملی ہوئی ہیں۔اگر ان میں قرب نہیں ہے تو بُعد بھی نہیں ہے۔

وہ لکھتی ہیں:

> "صحافی یا ادیب کو کوئی بات یا موضوع متاثر کرتا ہے، خواہ وہ ہنگامی نوعیت کا ہی کیوں نہ ہو۔وہ اس پر خالصتاً ادبی انداز میں تبصرہ کرتا ہے، بات سے بات نکالتا ہے، نکتہ آفرینی کرتا ہے اور وقتاً فوقتاً بذلہ سنجی سے کام لیتا ہے۔یہ وہ مقام ہے جہاں صحافت اور ادب کے ڈانڈے آپس میں ملنے لگتے ہیں اور "صحافتی ادب" کی ایک نئی اصطلاح وجود میں آتی ہے۔یہ اصطلاح ایسی صحافت کے لیے استعمال کی جاتی ہے جو ادب اور صحافت کے بین بین چلتی ہے۔(6)

ادب اور صحافت کے ضمن میں ایک گروہ ان تنقید نگاروں کا بھی ہے جو دور حاضر میں صحافت کی اثر انگیزی کا مداح ہے۔وہ سمجھتا ہے کہ دور حاضر میں صحافت بہت زیادہ طاقت ور ہو چکی ہے۔اس کا دائرہ کار بہت وسیع ہو چکا ہے۔روز بروز اس کی وقعت میں اضافہ ہو رہا ہے۔صحافت محض اعلانات تک محدود نہیں رہی ہے بلکہ اس کا عمل دخل بڑھتا جا رہا ہے۔سائنس اور ٹیکنالوجی کے ساتھ صحافت نے اپنا الائنس بنا کر اپنی وقعت میں اضافہ کیا ہے۔یہ گروہ دور حاضر میں اثر انگیزی کی صف میں صحافت کو ادب سے بھی ایک قدم آگے کھڑا کرتا ہے۔ان تنقید نگاروں میں ڈاکٹر سید احمد قادری کا نام اہم ہے جو صحافت کی زبردست وسعت اور بے پناہ طاقت کے قائل ہیں۔اس لیے انھوں نے صحافت کی طاقت اور وسعت کے حوالے سے پیش گوئی بھی کی ہے۔

وہ رقمطراز ہیں:

> "صحافت کا کینوس واقع وسیع و عریض ہے۔اس کا دائرہ عمل اور دائرہ کار اس قدر پھیلا ہوا ہے کہ اس کی سیاسی، سماجی، معاشرتی، تہذیبی، تمدنی اور اخلاقی ہمہ گیری، وسعت اور معنویت سے انکار نہیں کیا جا سکتا۔جیسے جیسے دنیا پھیل رہی ہے، ویسے ویسے صحافت کے قدم بھی آگے بڑھ رہے ہیں۔کل تک جو صحافت سرکاری اعلانات تک محدود تھی آج ترقی کی منازل طے کرتی ہوئی سرکار کی قسمت کا فیصلہ کرنے کی اہل بن گئی ہے۔صحافت، نگاڑوں، ڈرم اور لاؤڈ سپیکر کی آواز نکل کر پرنٹ میڈیا اور پھر الیکٹرانک میڈیا پر گویا اپنا قبضہ جمانے میں کامیاب ہے۔کل تک جو صحافت چند راجاؤں، مہاراجاؤں کے ہاتھوں تک محدود تھی وہ آج پوری دنیا پر سکہ جما چکی ہے اور قلمی اخبار سے الیکٹرانک میڈیا تک کا لمبا سفر طے کر کے اپنی اہمیت اور افادیت منوانے پر مجبور کر چکی ہے۔صحافت اپنے اندر اتنی طاقت، وسعت اور ہمہ گیری رکھتی ہے کہ جیسے جیسے سائنس اور

Recognized by HEC in Y-Category
ONLINE - ISSN- 3006-595X
PRINT - ISSN- 3006-5941

ٹیکنالوجی ترقی کی منازل طے کر رہی ہے ویسے ویسے صحافت بھی اپنے لیے راستہ ہموار کرتی جا رہی ہے۔ اکیسویں صدی میں یہ زیادہ مثبت اور تاریخ رول ادا کرے گی۔"(7)

ڈاکٹر سید احمد قادری نے صحافت کی جس طاقت کی بات کی ہے اس طرف ڈاکٹر سمیع احمد نے بھی واضح اشارہ کیا ہے۔ ڈاکٹر سمیع احمد کا شمار بھی چوتھے گروہ کے اہم نقادوں میں ہوتا ہے۔ وہ سمجھتے ہیں کہ دور حاضر میں صحافت نے جو طاقت حاصل کر لی ہے وہ اب ادب میں نہیں رہی۔ اس دعوے کے لیے انھوں نے بہت مضبوط تاریخی دلائل بھی پیش کیے ہیں۔ انھوں نے ادبی اور صحافتی طاقت اور اثر انگیزی کے ماضی و حال کا مثالوں سے عمدہ احاطہ پیش کیا ہے۔ وہ بتاتے ہیں کہ ایک زمانے میں ادب کا اثر رسوخ ارباب اختیار پر اتنا تھا کہ انھیں اپنے فیصلوں پر نظر ثانی کرنا پڑ جاتی تھی۔ فیصلہ سازی میں ادبی قوت استعمال میں لایا جاتا تھا۔ لیکن ماضی میں ادب جس طاقت کا حامل تھا، وہ طاقت اب صحافت کے پاس منتقل ہو چکی ہے۔ آج کے صحافی کی تحریر وہی کام کر رہی ہے جو ایک زمانے میں ادیب کی تخلیق سر انجام دیتی تھی۔ اب ادیب کی مسند پر صحافی کا نشیمن بن چکا ہے۔ اس سلسلے میں جو انھوں نے مثال پیش کی ہے، اس کا شامل کرنا دل چسپی سے خالی نہیں ہو گا۔

وہ لکھتے ہیں:

"صحافت میں جو قوت ہے وہ قوت اب ادب میں باقی نہیں رہی۔ محمود غزنوی یا الپ ارسلاں بادشاہ ایران کے وقت میں، اس میں بہت زیادہ قوت تھی۔ شاعر اور ادیب بادشاہوں کے ارادے میں تبدیلی لاتے تھے۔ انھیں وہی سوچنے پر مجبور کر دیتے تھے جو وہ خود سوچتے تھے۔ اس سلسلے میں فارسی کے نابینا شاعر رودکی کا واقعہ ہمارے سامنے ہے کہ بادشاہ اپنے لاؤ لشکر کے ساتھ شکار کی خاطر جنگل میں قیام پذیر تھا اور تین ماہ سے اوپر ہو گئے تھے وہ واپس جانے کا نام نہیں لے رہا تھا۔ اس کے درباریوں، وزیروں اور دوسرے اصحاب الرائے ملک الشعرا رودکی کے پاس آئے اور گزارش کی کہ کوئی تدبیر کریں کہ بادشاہ وطن واپس چلنے کو آمادہ ہو۔ اب بال بچوں سے دور رہے بہت دن ہو گئے۔ چنانچہ رودکی نے ان کی گزارش کا خیال کرتے ہوئے بادشاہ کی شان میں ایک قصیدہ کہا جس میں وطن کی ندی اور ہوا کا ذکر تھا۔ بادشاہ قصیدہ سن کر اتنا بے قرار ہو گیا کہ فوراً بغیر موزے پہنے وطن کی طرف چل کھڑا ہوا۔ رودکی نے جو قصیدہ پیش کیا تھا اس کا مطلع یہ ہے۔

بوئے جوئے مولیاں آید ہمی　　یادِ یارِ مہرباں آید ہمی

شعر و ادب میں اب یہ قوت شاید نہیں ہے مگر صحافت میں ہے۔ وہ ہفت اقلیم پر بسیط ہے۔ اس نے فرانس میں انقلاب برپا کیا۔ ہندوستان سے انگریزوں کو بھاگنے پر مجبور کیا۔"(8)

درج بالا تنقید نگاروں کی آرا نہایت وقیع ہیں۔ ہر ایک کی رائے کی کوئی نہ کوئی ایسی اصولی جہت ہے جس سے بے اعتنائی نہیں برتی جا سکتی۔ یہ بھی واضح ہوتا کہ ادب اور صحافت میں بُعد نہیں قرب کا عنصر زیادہ ہے۔ ان کی سرحدیں باہم ملی ہوئی ہیں۔ بعض مقامات پر تو صحافت ادب کی سرحد میں بھی داخل ہو جاتی ہے۔ لیکن دوسری طرف یہ کہنا کہ ساری صحافت ادب کا درجہ رکھتی ہے، درست نہیں ہو گا۔ کیوں کہ

Recognized by HEC in Y-Category
ONLINE - ISSN- 3006-595X
PRINT - ISSN- 3006-5941

اخبارات میں چھپنے والا ہر رطب و یابس ادا نہیں ٹھہرایا جاسکتا اور ٹی وی کی سکرین پر حرکت کرنے والی ہر تصویر ادب نہیں قرار دی جاسکتی۔ اس کے برعکس یہ دعویٰ بھی حقیقت سے دور ہے کہ صحافت میں ادبی عناصر کی موجودگی ممکن ہی نہیں۔

فی زمانہ صحافت نے اپنے زور بازو کی بنیاد پر اپنی وسعت اور طاقت میں بے پناہ اور قابل رشک اضافہ کر لیا ہے۔ جہاں زبان و بیان اور اسلوب کے لحاظ سے ہمیں ادب، صحافت پر فوقیت حاصل کرتا ہوا دکھائی دیتا ہے، تو وہاں طاقت اور معاشرے پر اثر پذیری کے باعث صحافت ادب کو مات دے رہی ہے۔ آج ایک ادیب کی نظم میں اتنی طاقت دکھائی نہیں دیتی جو اخبار کی سرخی میں موجود ہے۔ ٹی چینل کی ہیڈ لائن میں جو طاقت ہے وہ کسی ادیب کے نثر پارے کو شاید میسر نہیں ہے۔ ہمیں اس رائے سے اتفاق کرنا ہو گا کہ موجودہ دور میں صحافت ادب سے زیادہ قوت کی حامل ہے۔

ایک اور امر جو قابل توجہ ہے وہ یہ کہ تحریر اور تخلیق میں مقصدیت کا کلیدی کردار ہے۔ یہی مقصد ہی ہے جو فن پارے کی درجہ بندی کے لیے اہم ہوتا ہے۔ تجارتی مقاصد کے تحت لکھا جانے والا ادب اپنی اہمیت کھو بیٹھتا ہے۔ ادبی چاشنی رکھنے والا اخبار یا مضمون کسی ادبی نثر پارے سے کم درجے کا نہیں ہو سکتا۔ تاریخ ادب کے جائزے سے معلوم ہوتا ہے کہ اردو ادب کی کئی نامور شخصیات، ادب اور صحافت دونوں میں نام کما چکی ہیں۔ ان کو ادب یا صحافت میں سے کسی ایک صف میں کھڑا کرنے کی کوشش ناممکن ہے۔ یہ حقیقت ہے کہ اخبارات و رسایل میں شائع ہونے والے مضامین اور کالموں کی وجہ سے اردو ادب کی ثروت میں بے پناہ اضافہ ہوا ہے۔ یعنی اردو ادب کی ترقی کسی نہ کسی حد تک اخباری لکھاریوں کی مرہون منت ہے۔

ہمارے ہاں کچھ تنقید نگار صحافت اور ادب کو باہم متصادم سمجھتے ہیں۔ ان کے مطابق دونوں میں رقیبانہ عناصر موجود ہیں۔ ادب کسی اور راستے کا مسافر ہے اور صحافت کسی اور میدان کی شہ سوار ہے۔ ان میں کسی قسم کی کوئی مطابقت موجود نہیں ہے۔ میرے خیال میں یہ سوچ صحافتی قدر و قیمت سے ناانصافی پر مبنی ہے۔ ہمارے ان دوستوں کو درج ذیل سوالات کے جوابات تلاش کرنے ہوں گے۔

۱۔ مولانا ابوالکلام آزاد، مولانا حسرت موہانی، مولانا ظفر علی خان، اکبر الہ آبادی، منشی پریم چند، مولانا عبدالمجید سالک، چراغ حسن حسرت، شورش کاشمیری، ابن انشا، احمد ندیم قاسمی، انتظار حسین اور عطاء الحق قاسمی ایسے ناموں کی تحریروں کو ہم ادب یا صحافت کس خانے میں تقسیم کریں گے؟

۲۔ ایسی تحریر جو ادب کے معیار پر پورا اترتی ہو، ادبی اسلوب، بندش لفظی اور دیگر ادبی عوامل سے مزین ہو تو کیا اسے محض کسی اخبار یا صحافتی رسالے میں چھپنے کی وجہ سے ادب کی صف سے نکال باہر کریں گے اور اسے ادب ماننے سے انکار کر دیں گے؟

اس لیے ہمیں ماننا ہو گا کہ اگر کسی صحافی کی تحریر ادبی تقاضوں کو پورا کرتی ہے تو یقیناً ادبی تحریر کہلانے کی مستحق ہے۔ جبکہ کسی ادیب کی تحریر جو ادبی معیار پر پورا نہ اترے، ادب کا مقام حاصل نہیں کر سکتی۔

ادب اور صحافت کے باہمی تعلق کے حوالے سے ایک لطیفہ پیش کیا جاتا ہے جو اس بحث کا خلاصہ بھی ہے:

"ایک محفل میں مشہور صحافی احمد علی اور ان کی بیوی ہاجرہ مسرور، ابراہیم جلیس اور دوسرے بہت سے ادیب بیٹھے تھے۔ کسی نے ابراہیم جلیس سے پوچھا کہ ادب اور صحافت میں کیا رشتہ ہے؟

Recognized by HEC in Y-Category
ONLINE - ISSN- 3006-595X
PRINT - ISSN- 3006-5941

ابراہیم جلیس نے احمد علی اور ہاجرہ مسرور کی طرف اشارہ کر کے کہا کہ جو ان دونوں میں ہے۔"(9)

ادب اور صحافت کی بحث میں کچھ نقادوں نے 'صحافتی ادب' کی اصطلاح استعمال کی ہے۔ یعنی وہ ادب جو اخبارات ورسایل کے ذریعے سامنے آتا ہے اسے 'صحافتی ادب' قرار دیا جائے۔ بالفرض اگر یہ رائے درست ہے تو اس ادبی عمارت کی بیشتر اینٹیں صحافتی ادب کے گھر میں جا گریں گی۔ کیوں کہ ہم اردو کے ادب کے بیشتر شعرا کے دواوین اور کلیات، جن میں موجود ادبی تخلیقات کو ادب کا شاہکار قرار دے رہے ہیں، ان کا اکثر حصہ تو کلیات و دواوین کی تدوین و ترتیب سے قبل اخبارات ورسایل میں شائع شدہ ہے۔ یہی حالت نثری ادبی سرمائے کی ہے۔ ہمیں ان کے بنیادی اجزا اور عناصر کے مطابق ادب کو ادب اور صحافت کو صحافت ہی قرار دیا جائے۔ صحافتی ادب کی اصطلاح کے ذریعے قارئین کو کسی الجھن کا شکار نہ کیا جائے۔

حواشی

1. سمیع احمد، ڈاکٹر، "اردو صحافت اور تحریکِ آزادی" دہلی، ایجوکیشنل پبلشنگ ہاؤس، ۲۰۰۹ء، ص ۶۲
2. وزیر آغا، ڈاکٹر، "اردو ادب میں طنز و مزاح" لاہور، اکادمی پنجاب (ٹرسٹ) ۱۹۵۸ء، ص ۳۲۷
3. وزیر آغا، ڈاکٹر، "اردو ادب میں طنز و مزاح" لاہور، اکادمی پنجاب (ٹرسٹ) ۱۹۵۸ء، ص ۳۲۷
4. انور علی دہلوی "اردو صحافت"، دہلی، اردو اکیڈمی، ۲۰۰۶ء، ص ۶۵۲
5. شریف الدین، ڈاکٹر، "اردو صحافت اور حسرت موہانی" دہلی، ایجوکیشنل پبلشنگ ہاؤس، ۲۰۰۵ء، ص ۳۲
6. فوزیہ چودھری، ڈاکٹر، "اردو کی مزاحیہ صحافت" لاہور، سنگ میل پبلی کیشنز، ۲۰۰۰ء، ص ۳۴
7. سمیع احمد، ڈاکٹر، "اردو صحافت اور تحریکِ آزادی" دہلی، ایجوکیشنل پبلشنگ ہاؤس، ۲۰۰۹ء، ص ۴۳
8. سمیع احمد، ڈاکٹر، "اردو صحافت اور تحریکِ آزادی" دہلی، ایجوکیشنل پبلشنگ ہاؤس، ۲۰۰۹ء، ص ۸۲
9. ساقی، نارنگ، "قلم کاروں کی خوش کلامیاں" نئی دہلی، الحمد پبلی کیشنز، ۲۰۱۳ء، ص ۴۴